

حضرت شیخ الہند اور عصر حاضر کے چیلنجز

محمد عیسیٰ منصوری

چیرمین، ورلڈ اسلامک فورم لندن

برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد حضرت شیخ الہند محمود حسن دیوبندی کی خدمات سب سے نمایاں ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ملت اسلامیہ کو رام راج یا برہمن سامراج کا لقمہ تر بننے سے بچایا اور حضرت شیخ الہند نے برصغیر میں برٹش امپائر کے استحکام اور اسلام کے خلاف انگریز ہندو ملی بھگت کے بعد ملت اسلامیہ کی بقاء و رہنمائی کا پروگرام دیا، برصغیر کی تاریخ میں آپ کا کردار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، آپ نہ صرف مدرسہ دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، بلکہ بانی مدرسہ دیوبند حجة الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حقیقی علمی، فکری و عملی جانشین بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد برٹش امپائر اور برہمن سامراج نے ملی بھگت کر کے ملت اسلامیہ کو غلام اور شور و ہنارے کی منصوبہ بندی کر لی تھی، ملت اسلامیہ ہند کسی مجاہد پر دشمن کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتی تھی اور حوصلہ ہار چکی تھی کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں علماء، مشائخ اور دینی جذبہ رکھنے والے مسلمان ہزاروں نہیں، لاکھوں کی تعداد میں قتل و پھانسی پر چڑھ گئے یا کالا پانی و سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے گئے، ایسے نازک حالات میں ملت اسلامیہ کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والا یہ جاں فروش طبقہ (علمائے حق) ملت کے زخموں کو مندمل ہونے اور ایک نئی نسل کی تیاری کے لیے نئی حکمت عملی پر عمل شروع کر دیا، وہ حکمت عملی یہ تھی کہ کچھ عرصہ کے لیے دشمن کے سامنے سے ہٹ کر اسے غافل کر دیا جائے اور تعلیم و تربیت اور جہاد سے لیس ایک اور نسل تیار کی جائے، اس مشن کی خاطر دیوبند میں مدرسہ اور گنگوہ میں خانقاہ کے نام سے کام شروع ہوا، بقول حجة الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی ”میں نے (دشمن کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے) اپنے مشن پر علم کی چادر ڈال دی ہے“ اور بقول حضرت شیخ الہند ”حضرت الاستاذ نے یہ مدرسہ کیا محض درس و تدریس کے لیے قائم کیا تھا؟ بلکہ شاملی کی شکست کے بعد تلافی کے لیے یہ حکمت اقدام تھا۔“

آج بھی ہم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی پالیسی و حکمت عملی کے دور میں ہیں، برصغیر میں دین کے تمام تر شعبوں کا سلسلہ حضرت شیخ الہند کی ذات پر مشتملی ہوتا ہے، حضرت تھانویؒ ہوں یا علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ ہوں یا مولانا محمد الیاسؒ یا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔ بیسویں صدی کے تقریباً سب ہی اکابر حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے، ان اکابر نے ملت اسلامیہ کے تحفظ و بقاء و احیاء و سر بلندی کے لیے الگ الگ محاذ سنبھالا، حضرت مدنیؒ کا اصل محاذ یہ تھا کہ برصغیر اور عالم عرب سے انگریزوں کو نکالا جائے۔ حضرت تھانویؒ کا اصل کام تصوف کے متعلق، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے ادھورے کام کی تکمیل تھی یعنی تصوف کو بدعات و محدثات عجمی و بیرونی اثرات سے پاک و صاف کر کے قرآن و سنت کے عین مطابق بنا دیا جائے۔ حضرت مولانا الیاس کا اصل کام ملت اسلامیہ کو جو کلمہ نماز اور دین کی مبادیات تک سے دور ہو گئی تھی ان کے ایمان کو تازہ اور قوی کر کے انھیں پورے دین پر مستقیم کر دیا جائے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایسے دور میں عالم اسلام سے حدیث اور علوم حدیث ختم ہو رہے تھے، ملت اسلامیہ میں حدیث کے علوم کا احیاء کیا وغیرہ وغیرہ یہ سب ہی اکابر حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔

بانی مدرسہ دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو ملت اسلامیہ ہند کی بقاء و سر بلندی کے لیے خاکہ تیار کرنے کے بعد زیادہ وقت نہیں ملا، آپ چالیس سال کی عمر ہی میں جواری رحمت میں پہنچ گئے، آپ کے مشن کی تکمیل حضرت شیخ الہندؒ نے کی۔ آج دیوبندیہ کے لیے اگر کوئی ہستی کامل آئیڈیل و نمونہ ہے تو وہ حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی ہے، دیوبندیہ نام ہے چار اوصاف کا: (۱) علم کامل (۲) عمل کامل (۳) تقویٰ کامل (۴) حمیت و غیرت کامل۔ آج ہم علمی عملی فکری ہر اعتبار سے حضرت شیخ الہندؒ کے دور میں ہیں۔ آج برصغیر کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے علماء آپ کے شاگردوں کے تیار کردہ ہیں۔

یاد رہے حضرت شیخ الہندؒ کی جدوجہد صرف مسلمانان برصغیر کے لیے نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے تھی، آپ خوب سمجھتے تھے کہ برصغیر سے انگریزوں کے قدم اکھڑتے ہی وہ عرب اور دیگر مسلم ممالک پر قبضہ برقرار نہیں رکھ سکے گا، چنانچہ آپ نے اپنے راز دار و شاگرد رشید حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو جس مشن پر روانہ کیا تھا وہ عالمی مشن تھا، جس میں جرمنی (یورپ) سے اسلحہ خلافت عثمانیہ سے عسکری مدد، افغانستان سے راہ داری و فوجی اور قبائلی علاقوں سے جاں باز سپاہی لے کر پورے برصغیر کو انگریزوں سے آزاد کروانا تھا، حکومت کو اپنے خفیہ اداروں سے تھوڑی سی بھٹک مل گئی، اسی لحاظ سے انگریزوں نے خفیہ میسج بھیجا، آپ گرفتاری سے قبل فوراً اجازت نکل جائیں، حجاز میں آپ خلافت عثمانیہ کے ترکی گورنر (مدینہ) غالب پاشا اور ان کے واسطے سے خلافت عثمانیہ کے وزیر جنگ انور جمال پاشا سے ملاقات کر کے اپنے مشن کو آگے بڑھا رہے تھے، دوسری طرف برطانوی شعبہ انٹیلیجنس نے لارنس آف عربیہ کے

ذریعہ عربوں کو ترکوں سے آزادی کا جھانہ دے کر حجاز میں ترکی کے مقرر کردہ حکمران شریف مکہ کو غداری پر آمادہ کر لیا۔ خلافت عثمانیہ کے ان غداروں نے حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کو قید کر کے برطانیہ کے حوالے کر دیا، اس طرح آپ تقریباً ساڑھے تین سال مالٹا میں قید رہے، آپ نے قید میں جو صعوبتیں اٹھائیں، بڑھاپے میں آپ کا جسم زار و زار ہو گیا اور متعدد موذی امراض لگ گئے، چناں چہ رہا ہو کر ہندوستان واپس ہوئے تو جسم کی ساری توانائی نچڑ چکی تھی، یہ مشکل ساڑھے پانچ ماہ زندہ رہے وہ بھی مسلسل صاحب فراس اور وجع المفاصل، ہیچس، بواسیر، تپ لرزہ جیسے متعدی موذی امراض کا شکار رہ کر، لیکن آپ اپنے مقاصد سے ذرا غافل نہیں ہوئے، آپ کی فکر و کار کردگی دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنی فکر، حکمت عملی اور پالیسی کے اعتبار سے اس وقت عالم گیریت (گلوبلائزیشن) کے دور میں تھے جب یورپ محض نیشنلزم (وطنیت) کے دور میں تھا۔

آپ ۸/ جون ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے رہا ہو کر بحری جہاز کے ذریعہ ممبئی پورٹ پہنچے، ممبئی میں دو روز نہایت مصروف گزارے، بندرگاہ سے مولانا شوکت علی اور تحریک خلافت کے ہزاروں پر جوش رضا کارشان دار جلوس کی شکل میں خلافت کمیٹی کے مرکزی دفتر واقع محمد علی روڈ لے گئے، ممبئی میں بھارت کی اہم سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں اور مشاہیر سے آپ نے ملاقاتیں کیں جن میں مہاتما گاندھی اور مولانا عبدالباری فرنگی محل جیسے رہنما شامل تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پورے برصغیر میں حضرت شیخ الہند کے مقام و مرتبہ کا کوئی رہنما نہیں تھا، نہ صرف طبقہ علماء نے، بلکہ کانگریس، کیونسٹ و شوٹلسٹ پارٹیوں سمیت سب ہی نے آپ کو اپنا عظیم رہنما تسلیم کیا۔ دیوبند جا کر بھی آپ تمام سیاسی لیڈروں سے رابطہ میں رہے، لیکن مدرسہ دیوبند کو حکومت کے غیض و غضب سے بچانے کے لیے آپ نے اپنے رابطے انتہائی خفیہ رکھے، آپ دیوبند میں مدرسہ سے دور ایک مکان میں سکونت پذیر ہوئے، جسے کوشی کہا جاتا تھا، کانگریس کیونسٹ و شوٹلسٹ اور دیگر پارٹیوں کے رہنما حضرت شیخ الہند سے ملاقات و مشورہ کے لیے عموماً گہری رات کے بعد خاموشی سے آتے اور کوشی میں ٹھہر جاتے، آپ آدھی رات کے بعد ان سے چپکے سے ملاقات فرمالتے، سرحد کے خدائی خدمت گار (خان عبدالغفار خان) کو حکم تھا کہ دیوبند نہ آئیں، بلکہ دیوبند سے پہلے یا بعد کے اسٹیشن پر اتریں، آپ وہیں پہنچ کر ملاقات کر لیں گے۔

اسارت مالٹا کے دوران آپ ملت اسلامیہ کی سر بلندی کے لیے مسلسل غور و خوض فرماتے رہے، چناں چہ ہم دیکھتے ہیں واپسی پر آپ نے اپنی پالیسیوں (حکمت عملی) کو یکسر تبدیل فرمادیا، آپ کی نئی حکمت عملی و پالیسی کے دو بنیادی ستون تھے، ایک عسکریت کے بجائے ڈائلاگ، آپ نے دیکھا کہ عالم کفر بدن طاقتور اور عالم اسلام کمزور و بے بس ہوتا جا رہا ہے اور اپنوں (مسلمانوں) میں غداری و بے وفائی آگئی (ریشمی رومال کی تحریک اپنوں کی غداری ہی سے ناکام ہوئی) چناں چہ ایک قابل جرنیل کی طرح آپ نے جنگ کی حکمت عملی تبدیل کی آپ مسلسل

دیکھ رہے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے مسلمان جہاد کا نعرہ لگا کر برطانیہ عظمیٰ سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہے، کیوں کہ انگریز برادرانِ وطن (ہندو) کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کی جہادی تحریکوں کو کچل دیتا تھا، ہندوستان میں ہندو انگریز کا ہاتھ تمام کر ایک مضبوط اور طاقتور قوم بن رہا تھا اور مسلمان ٹکرا کر ختم ہو رہے تھے، اسی لیے آپ کی نئی حکمت عملی یہ تھی کہ ڈائیلگ کے ذریعہ برادرانِ وطن کو آزادی کی جدوجہد میں ساتھ لیا جائے، آپ جانتے تھے کہ مسلمان تو پیچھے رہ کر بھی اپنے حصہ سے زیادہ قربانیاں دیں گے، مگر ہندو قوم مسلمان لیڈر شپ میں قربانی نہیں دے گی، آنے والی قیادت کے لیے ہندو (مہاتما گاندھی) کو آگے کیا، کیوں کہ جب تک اکثریت ساتھ نہیں دیتی انگریز کو برصغیر چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، آپ نے دوسری حکمت عملی یہ اختیار فرمائی کہ لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم نے مسلمانوں کے مقتدر طبقات اور شرفاء کو انگریز کی سوچ و فکر اور طرز زندگی کا وارث بنا دیا تھا، آپ نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف دستِ شفقت بڑھا کر انھیں اپنا ترجمان بنا لیا، اس طرح انھیں اپنی سوچ و فکر اور اسکولوں کا وارث بنا لیا، اس لیے آپ انتہائی ضعف و بیماری کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے، تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنے درد و فکر میں شریک کر کے انھیں انگریز کے خلاف کھڑا کریں۔ آپ کے ضعف و نقاہت کا یہ عالم تھا کہ آپ دیوبند سے پاکی میں لیٹ کر روانہ ہوئے، نقاہت کی وجہ سے خطبہ صدارت نہیں پڑھ سکتے تھے جو مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا جس میں آپ نے فرمایا:

”میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر، اس لیے لبیک کہا کہ اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔“

پھر فرمایا:

”اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پکھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔“

اسی خطبہ صدارت میں آپ نے فرمایا:

”آپ میں جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی بھی وقت کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا! ہاں بے شک یہ کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا کہ لوگ نصرانیت (مغربیت) کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں یا لہذا گستاخوں سے اپنے مذہب یا مذہب والوں کا

مذاق اڑاتے یا حکومتِ وقت کی پرستش کرنے لگتے ہیں، ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے۔“

آپ کے بے قرار دل سے نکلی صدانے جدید طبقہ کے دل کو مسخر کر لیا، چنانچہ جب آپ نے ترک موالات یعنی برطانوی حکومت سے ہر طرح کا تعاون ختم کرنے کی اپیل کی تو یونیورسٹی کے بہت سے طلباء نے یونیورسٹی سے رشتہ توڑ لیا۔ یہ واقعہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کا ہے، اس طرح دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کی دوسری بڑی یونیورسٹی حضرت شیخ الہند کی بدولت وجود میں آئی۔ غرض حضرت شیخ الہند نے مانٹا سے واپسی پر برصغیر کی ملت اسلامیہ کو دو بنیادی پالیسیاں عطا کیں (۱) ڈائیلگ (۲) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو قریب کر کے انھیں اپنا ترجمان بنانا۔

اگر ہم ڈائیلگ کی راہ پر ہوتے تو آج عالم گیریت کے دور میں اقوامِ عالم سے ڈائیلگ کے ذریعہ قرآن کے مطابق انسانی مسائل کا حل پیش کر رہے ہوتے، اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقہ عالمی حالات کو جتنا سمجھتا ہے قدیم طبقہ نہیں اور جدید طبقہ کے پاس وہ زبان و اسلوب ہے جسے اقوامِ عالم سمجھتی ہیں، صرف اس کے پاس قرآن و سنت کی صحیح رہنمائی نہیں ہے، اگر یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو ملتِ اسلامیہ کی کشتی موجودہ حالات کے بھنور سے نکل سکتی ہے، کاش حضرت شیخ الہند گوزندگی نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو آپ کسی حد تک قدیم و جدید کی خلیج پاٹ دیتے، سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ طبقہ علماء نے حضرت شیخ الہند کے بعد آپ کی حکمتِ عملی فراموش کر دی نہ ڈائیلگ جاری رہا، نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو قریب کر سکے، بلکہ دونوں طبقات میں دن بہ دن فاصلہ بڑھتا گیا۔

حضرت شیخ الہند کے بعد آپ کے شاگردوں (جو بلا واسطہ یا بالواسطہ تقریباً تمام ہی علماء دیوبند ہیں) آپ کی جدید پالیسی کے دونوں نکات پر توجہ نہیں دی، اگر طبقہ علماء ۱۹۲۰ء کے بعد حضرت شیخ الہند کی پالیسی کے دونوں نکات پر کار بند ہو کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا لیتے تو برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔

بندہ گذشتہ دنوں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ملفوظات پڑھ رہا تھا، حضرت بار بار نہایت رنج و غم سے فرماتے: ”مولوی ہار گیا“ اور یہ مولوی اس وقت تک ہارتا رہے گا جب تک حضرت شیخ الہند کی پالیسی پر نہیں آتا اور عصری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔

☆.....☆.....☆